ڈاکٹر سبینہ اویس اعوان
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج وومن یونیورسٹی، سیالکوٹ
ڈاکٹر ساجد جاوید
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا

Dr. Sabina Awais
Associate Professor, Govt. College Women University, Sialkot

Dr. Sajid Javaid
Assistant Professor, University of Sargodha

اکبر الٰہ آبادی کی شاعری.....مزاحمتی عناصر کے پس منظر میں

"Resistant Elements in Akbar Ala Abadi's Poetry"

Abstract: Akbar Ala Abadi is a famous poet of Urdu literature. He had great standing in maintaining a standard in historical, revolutionary and resistant era of poetry. By the amalgamation of conventional and modern ideas, he gave a new language, accent and thought to readers of Urdu literature. He presented realities of life in a simple but attractive way. Keeping in view societal abnormalities, he adopted humoristic way of writing. Irrespective of his humoristic nature, he possessed soft corner for the down trodden people of his nation, Akbar Ala Abadi's piece of writings revolves around national culture and civilizations. It was the time when our culture and civilization was on the brink of extinction, he considered religion and belief, the foundation of our lifestyle. His unshakeable love for his religion and national interest forced him to raise voice against the brutal forces of the west blatantly. In this article, poetry of Akbar Ala Abadi will be examined in the light of resistant elements.

Key words: Famous Poet, Historical, Revolutionary, Resistentant Element, Modern Ideas, Realities of Life, Attractive way, National Culture, Civilization, Love, Religion.

ادب زندگی کا عکاس ہے اگر اس کے تاریخی ارتقا پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ موجود سے نا مطمئن رہا ہے ناموجود کا دلدادہ رہا ہے اور اس کا رُخ بے چینی کی جانب رہا ہے۔ادب کی بنیاد متخیلہ پر ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے تحرک اور تبدیلی اسے پسند آتی ہے۔ادب کے مزاج کی اسی بے چینی کا رنگ بعض اوقات بغاوت کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ جب انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مزاحمت کی روایت خود انسانی زندگی کی جتنی پُرانی ہے۔ ظلم اور امن کے خلاف مزاحمت اور احتجاج کا سلسلہ تو حضرت آدمؑ کے بیٹوں سے ہی شروع ہو گیا تھا تب سے لے کر عصرِ حاضر تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

مزاحمت عربی زبان کے لفظ ''زخمہ'' سے مشتق ہے جس کے لُغوی معنی حریف سے ٹکرانے یا مدافعت کے ہیں۔اصطلاحی معنی میں مزاحمت سے مراد وہ طرزِ عمل ہے جو کسی ناموافق صورتِ حالات کو اپنانے سے انکار اور ناآسودگی کا اظہار ہے۔مزاحمت انسانی سرشت میں شامل ہے اس کی ابتدا

غالباً اسی وقت ہو گئی تھی جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے منع کیے جانے کے باوجود حضرت آدمؑ نے شجرِ ممنوعہ کو ہاتھ لگایا اور معتوب ہوئے۔ انسانی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو مزاحمت کی یہی وہ انسانی جبلت تھی جس کے زیرِ اثر سقراط نے زہر کا پیالہ پیا مگر سچ کا دامن نہ چھوڑا۔ دنیا کی ترقّی یافتہ زبانوں کی طرح اردو شعر وادب میں بھی مزاحمت کی مستحکم روایت پائی جاتی ہے چوں کہ اردو زبان وادب کے ڈورے صوفیانہ ملفوظات سے ملتے ہیں۔ مزاحمت کی روایت کا سراغ اردو ادب کے اسی تشکیلی دور سے لگایا جا سکتا ہے ظاہر پرستی کی مخالفت صوفیانہ شعری روایت کا بنیادی عنصر ہے اسی لیے جب بھی ملائیت نے اہلِ اقدار خلاف غلط فیصلوں پر مہرِ توثیق ثبت کی۔ طریقت نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ مزاحمتی اردو شاعری کا زندہ استعارہ منصور بن حُلاج بھی اسی روایت کا روشن استعارہ ہے۔ اردو ادب میں مزاحمت سے مراد یہ ہے کہ اگر ادیب موجودہ صورتِ حالات سے مطمئن نہ ہو جبر و استحصال کے خلاف آواز بلند کرے تو عمومی معنوں میں ایسا ادب مزاحمتی ادب کے زمرے میں شامل ہوگا۔ اس حوالے سے اردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو شمالی ہند میں شاعری کا آغاز ہی مزاحمتی رویے سے ہوا اور جعفر زٹلی کو پہلا مزاحمتی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

مزاحمت دراصل کسی نظریے یا فکر کو قبول کرنے سے انکار ہے جب کبھی نظریۂ فکر کے خلاف مزاحمت کی صورت میں ردِّ عمل کا اظہار کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ہے کہ انکار کرنے والے کی حیثیت محکوم یا مجبور بے بس کی ہے جس کے خلاف مزاحمت کی جا رہی ہے وہ طاقتور بن کر مزاحمت کرنے والے پر مسلط ہے۔ ادب میں مزاحمت سے مراد ہے کہ نظامِ فکر یا نظریے کو قبول کرنے سے انکار ہے، یعنی اپنی روایت سے بغاوت اور موجودہ جبری تسلط سے انکار ہی ادب دراصل مزاحمتی ادب کہلاتا ہے۔ مزاحمتی ادب کی اصطلاح عہدِ آمریت میں وجود میں آئی۔ ادب کے حسّاس طبقے نے ہمیشہ ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف حق و صداقت کا علم بلند کیے رکھا۔ ادیب و شاعر نے محکوم و مجبور، مظلوم کے ساتھ کھڑے ہو کر سچائی کا راستہ اپنایا اور اپنی تحریروں سے مجبور و محکوم کے احساسات وجذبات کو بیان کیا۔ اردو ادب میں قدیم شعری اصناف میں شہرِ آشوب، مرثیہ نگاری میں مزاحمتی ادب کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں ان اصناف میں ان معاشرتی وثقافتی رویوں سے جبری استحصال سے مزاحمت ملتی ہے، ان جبری رویوں اور دستور کو شعرا اور شاعرات نے اپنے تخلیقی رنگ میں پیش کیا۔ مزاحمت، احتجاج اور انقلاب قریباً یکساں مفہوم کے حامل الفاظ ہیں۔ اردو ادب کے نام ور شاعر اور شاعرات نے اپنے ماحول سے بغاوت کی اور یہی بغاوت، انقلاب اور مزاحمت ان کی پہچان بنی۔ ان میں قرۃ العین طاہرہ، فروغ فرخ زاد کے علاوہ مزاحمتی اردو شاعری کا ایک ستارہ اور انا الحق کا دعویٰ کرنے والا منصور حُلاج اس روایت کا ایک حصہ ہے۔ علاوہ ازیں جعفر زٹلی، اکبر الٰہ آبادی، علامہ اقبال، فیض احمد فیض، ن۔م۔راشد، مجید امجد، حبیب جالب اور احمد فراز کے نام شامل ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی اردو شاعری کے تاریخی، اصلاحی اور انقلابی دور کے شعرا میں منفرد مقام کے حامل ہیں۔ اقبال نے انھیں ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا:

> "آپ کی زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ نہایت پُر معنی اور مفید ہوتے ہیں ان کو جمع کر لینا چاہیے تاکہ آیندہ نسلیں ان سے فائدہ اٹھا سکیں"۔ (۱)

1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد برِّصغیر پاک وہند کا ایک طبقہ ایسا تھا جو انگریزوں کے تسلط کو دائمی سمجھ کر مغربی تہذیب کی اندھادُھند تقلید کر رہا تھا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو مغرب کی سائنسی ترقی اور انگریزوں کی انتظامی صلاحیتوں سے مرعوب تھا۔ سر سیّد احمد خاں انگریزوں سے تعاون کے علمبردار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی بقا کے لیے انگریزی علوم کی تحصیل ضروری ہے وہ مسلمانوں کو انگریزوں کا وفادار بن کر رہنے کی تلقین کرتے

اسی میں مسلمانوں کی فلاح و اور بقا سمجھتے۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی معاشرت سے قربت کا نتیجہ یہ نکلا کہ برِّصغیر پاک و ہند کے مقامی لوگوں نے انگریزی معاشرت اپنانا شروع کی۔ انگریزی لباس لوگوں میں مقبول ہونا شروع ہوا۔ انگریزی زبان اور فرنگی تہذیب کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اپنانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ انگریزی تہذیب سے محبّت ہونا شروع ہو گئی اور اپنی تہذیب و ثقافت اور زبان کو نظر انداز کرتے اور اسے اپنانے میں شرمندگی محسوس کرنے لگے۔ جبکہ دوسری جانب ایک طبقہ ایسا تھا جب وہ برِّصغیر کے عوام کو انگریزی معاشرت سے مرعوب دیکھتے تو انھیں روکنے کی کوشش کرتے یہ طبقہ ایسا تھا جو انگریزی تعلیم کو بُرا نہیں سمجھتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب سے جُڑے رہنے کے بھی خواہاں تھے ان میں اکبر الٰہ آبادی اور علامہ اقبال شامل تھے۔ اکبر الٰہ آبادی نے اپنی شاعری کے ذریعے ہدفِ ملامت بنایا۔ مزاحمت کا رویّہ اگرچہ جعفر زٹلی کی شاعری میں بھی دکھائی دیتا ہے لیکن ان کا مزاج ہزل گوئی کی جانب راغب تھا اس لیے وہ اس سمت سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اکبر کی شاعری میں اگرچہ قدامت کا رنگ غالب ہے مگر مغربی تہذیب کے خلاف ان کا برملا احتجاج ہے۔

اکبر نے مغربی تہذیب، مغربی تقلید کو نشانۂ ہدف بنایا۔ انھوں نے انگریزوں کی برِّصغیر میں آمد، انگریزوں کے بنائے ہوئے اداروں، انگریزی طرزِ معاشرت، انگریزوں کی تقلید، انگریزی تعلیم، ہندوؤں اور مسلمانوں کے تنازعات پر تنقید کی اور طنز و ظرافت کے پیرائے میں اپنے ردِّ عمل کا اظہار بھی لکھتے ہیں:

وہ تو گرجا پر رُکا اور یہ گیا کعبہ کو پھاند
شیخ کا ٹٹو تو انجن سے بڑھ کر تیز ہے　　(۲)

اکبر لفظی مزاح سے تجنیس سے بھی کام لیتے ہیں۔ مثلاً:

عاشقی کا ہو بُرا اس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی-اے ہو گئے　(۳)

ہندوستانی اپنی لاعلمی کے سبب مرعوبیت کے اس جال میں خوشی سے پھنستے جا رہے ہیں۔ اکبر کے درج ذیل اشعار یہ تمام صورتِ حال اور اس کے خطرناک نتائج واضح ہوئے ہے۔ اکبر اس اندھی تقلید کے خلاف تھے جس میں ہندوستانی قوم مبتلا تھی انھوں نے طنز و مزاح کے انداز میں اس صورتِ حال کی مضحکہ خیزی کو بیان کیا دوسری جانب اس سے جو مضر اثرات مرتب ہو رہے تھے اس کی جانب لوگوں کی توجہ مبذول کروائی۔ اکبر دیکھ رہے تھے کہ مغربی تہذیب کی تقلید میں مسلمان مذہب سے بیگانہ ہو رہے تھے انھیں اس کا بھی شدید دُکھ تھا۔

اکبر اس تعلیم کے خلاف تھے جسے پڑھ کر ہندوستانی نوجوان نسل اپنے ماضی، تہذیب اور قومی ورثے سے بیگانہ ہوں یا اپنی تہذیب یا قدروں کو اپنانے میں عار محسوس کریں۔ اکبر کی شاعری مشرقی وضع داری، مشرقی قدروں کی علمبردار ہے۔ وہ سر سیّد اور اس دور پر طنز کرتے ہیں۔ سر سیّد سے اختلاف کی بنیادی وجہ مغربی تعلیم اور طرزِ بود و باش تھی۔

اکبر الٰہ آبادی ایک خوددار اور بے باک شاعر تھے۔ نہ بکنے والے اور نہ ہی دنیاوی خداؤں کے سامنے جھکنے والے۔ انھیں حاکم کی تلوار سے زیادہ اپنے قلم پر مان تھا۔ یہ حق و صداقت کا پرچم بلند کرنے کے ہنر سے بھی آگاہ ہیں۔ یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ اکبر الٰہ آبادی کی شاعری کا بیش تر حصہ احتجاج پر

مشتمل ہے۔ ان کے نزدیک مزاحمتی شاعر کا ہدف مذہبی پیشوا اور سیاسی رہنما ہیں انھیں خوب صورت خواب دکھاتے معصوم عوام کو دھوکا دیتے ان پر حکومت کرتے، ان کا مقصد اپنے عزائم کی تکمیل ہے نہ کہ عوامی خدمت ان کے پیشِ نظر ہوتی ہے۔ اکبر نے کہیں درپردہ اور کہیں واشگاف انداز میں برطانوی شہنشاہیت اور مغربی استعمار کے خلاف وار کیے۔ اکبر گورنمنٹ ملازم ہونے کے باوجود حق بات کہنے سے باز نہیں آتے۔

افراد اور معاشرے کی درست تربیت کے لیے ''تعلیم'' بہترین وسیلہ ہے۔ اکبر کے نزدیک انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے عورت امورِ خانہ داری سے بے گانہ ہو جائے گی۔ انھیں خدشہ تھا کہ عورت انگریزی تعلیم اور تہذیب کی دلدادہ بن کر مشرقی تہذیب کو نظرانداز کرے گی جس سے معاشرے میں بے حیائی پھیل جائے گی۔

انگریز برِّصغیر کی لڑکیوں کو اپنے زاویۂ نظر سے تعلیم دے رہے تھے مشرق کے لیے یہ تعلیم نئی تھی اور اس کے خلاف مزاحمت کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ انھیں خطرہ تھا کہ یہ تعلیم سماجی ڈھانچے کو تباہ کردے گی سو انھوں نے مزاحمت کا انداز اپناتے ہوئے اس کی خامیوں کی نشاندہی کی۔

اکبر کے نزدیک عورتیں مغربی تعلیم و تہذیب کو اپنا کر مشرقی تہذیب کو ختم کردے گی جب سبھی لڑکیاں گھر سے باہر معاشرے میں نکلیں گی تو منظر دل خراش ہو گا اس خوف کو وہ اشعار کی صورت میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔ اکبر کی شاعری میں دو قسم کی عورتوں کا تصور ملتا ہے ایک مشرقی عورت اور دوسری مغربی عورت۔ مشرقی عورت ان کے نزدیک قابلِ احترام ہے کیونکہ وہ شرم و حیا کا پیکر ہونے کی وجہ سے قابلِ احترام ہے جبکہ مغربی تعلیم کو وہ تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں۔

اکبر پردے کو عورت کے لیے ضروری سمجھتے تھے ان کے نزدیک بے پردگی بہت سے سماجی مسائل پیدا کرتی ہے۔ وہ پردے کو مذہبی اور سماجی زاویۂ نگاہ سے ضروری سمجھتے تھے۔

پردے سے متعلق ان کے اشعار ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا (۴)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

تعلیمِ دختراں سے یہ اُمید ہے اور
ناچے دُلھن خوشی سے خود اپنی برات میں (۵)

لسان العصر اکبر نے محولہ بالا امور کی جانب اشارہ از راہِ مذاق کروایا لیکن جدید عہد کے تناظر میں دیکھیں تو اکبر کے خدشات درست ثابت ہوئے ہیں۔ اکبر عورتوں کی دینی تعلیم حاصل کرنے حق میں ہیں جو اُمورِ خانہ داری، بچوں کی تربیت اور شوہر کی رفاقت میں مددگار ثابت ہو۔ اکبر کے نزدیک

عورتوں کو تعلیم گھر کی حفاظت، شوہر کی خدمت کے لیے دینی چاہیے۔ اکبر تعلیمِ نسواں کے مخالف نہیں تھے انھوں نے اپنی شاعری میں تعلیمِ نسواں کی تلقین کی۔

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو تو بے شعور ہے
حُسنِ معاشرت میں سراسر فتور ہے
اور اس میں والدین کا بے شک قصور ہے (۶)

اکبر جدید تعلیم کے مخالف نہیں بلکہ ان پہلوؤں کی مذمت کرتے ہیں جو سائنس اور فلسفہ کی آڑ میں مذہبی زندگی کو فراموش کرنے کا درس دیتے ہیں۔ مذہب سے وابستہ قدیم روایات سے بے زاری کا سبب بنتے ہیں۔ انگریزی تہذیب و معاشرت کو بطور نمونہ اپناتے ہیں۔ اپنی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے۔ مشرقی روایات واقدار کو اپنانے میں عار محسوس کرتے۔ اکبر کے نزدیک یہ تریاق زہر ہے۔

برّصغیر پاک و ہند میں چونکہ مذہبی اور ثقافتی قدریں مغرب کی نسبت مضبوط تھیں اس لیے جدید نظریات کو بہت پذیرائی تو نہ ملی تاہم کچھ مغرب پرست لوگ مغربی نظریات سے مرعوب ہوئے اور اس کا پرچار اپنی گفتگو اور تحریروں میں کرنے لگے اس طرح وہ خود کو عالم اور دوسروں کو جاہل ثابت کرنے میں مصروف تھے۔ اس قسم کے لوگ اکبر کی تنقید کا نشانہ بنے۔ یہ انگریزی طرز کے بنگلے بنواتے۔ انگریزی طرز کا فرنیچر استعمال کرتے۔ انگریزی لباس پہنتے، انگریزی لکھتے اور بولتے تھے۔ یہ وہ طبقہ تھا جو انگریزی کی سرپرستی میں چلنے والے تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہوئے تھے۔ اکبر اس طبقے پر طنز کرتے ہیں:

پبلک میں ذرا ہاتھ ملا لیجیے مجھ سے
صاحب میرے ایمان کی قیمت ہے تو یہ ہے (۷)

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے (۸)

برّصغیر میں ایک طرف تو مقامی ثقافت تھی اور دوسری جانب انگریز کلچر کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ذہنی انتشار لوگ ہنس کی چال چلنے کے شوق میں اپنی چال بھولتے جارہے تھے۔

واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر
پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی (۹)

اکبر نے اہلِ مشرق کو سمجھایا کہ اپنے اندر وہ جوہر پیدا کریں جس سے ملک ترقی کی راہوں پر گامزن ہو۔ اکبر نے ایک مصلح کا کردار ادا کرتے ہوئے نئی تہذیب کی تقلید کرنے والوں پر مزاحمت کی۔ اکبر کے نزدیک مغربی تقلید کی ایک بڑی وجہ یہ ہے۔ اکبر مغربی تہذیب و تمدن کو اخلاقی اقدار سے تہی

اور جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری خیال کرتے تھے اور مسلمانوں کے لیے اس کی پیروی زہر ہلاہل سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں مغربی معاشرت اور فرنگی تہذیب سے بیزاری کا جذبہ موجود ہے اور اس کی بیخ کنی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

اکبر کو رجعت پسند اور نئی روشنی، نئی تعلیم سے بیزار سمجھا جانے لگا جبکہ حقیقتاً ایسا نہیں اکبر کو رنج ہے کہ برِّصغیر پاک و ہند کے نوجوان محض ظاہری تعلیم کی جانب راغب ہیں المیہ ہے کہ یہ علم تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن ہنر کی جانب مائل نہیں نہیں ہوتے۔ یورپ اقوام کی محنت و مشقت، حکمت اور دوراندیشی سے سبق حاصل کرتے اور نہ ہی انگریزی تعلیم کی روح کو حاصل کرتے ہیں بلکہ انگریزی نقالی میں مگن ہو کر اپنی فطری طبع کو کھو دیتے ہیں اور قومی حمیت کو مجروح کرتے ہیں۔ نوجوان مغربیت کی خارجی خوش نمائیوں سے بہت متاثر ہوئے۔ انگریزی تعلیم سے متاثر ہونے کے بعد معاشرتی اور تمدنی زندگی کے طور طریقوں میں جدت تو آتی مگر مشرقی روح کہیں کھو گئی جس کا رنج اکبر کو بہت تھا۔

اکبر کا شمار اُن افراد میں ہوتا ہے جو نہ تو انگریزی کی رو میں بہنے کے قائل تھے اور نہ ہی خود پر ملائیت کی چھاپ کے خواہاں تھے۔ اکبر معاشرتی تغیر و تبدل کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے ایسا ردِ عمل ظاہر کیا اور مزاحمتی شاعر کے طور پر سامنے آئے ان کی مزاحمت سیاسی و معاشرتی دونوں میدانوں میں تھی تاہم شدت کے ساتھ انھوں نے سماجی میدان میں مزاحمت کی۔ انھوں نے اپنے دور میں ادبی، معاشرتی اور سیاسی رجحانات پر منفرد انداز میں تنقید کی۔ ان کا خیال تھا کہ کسی بھی زبان کو محض علم کے طور پر سیکھنا قابلِ تعریف ہے مگر ذہنی غلامانہ اور معذرت خواہانہ رویے کے ساتھ سیکھنا قابلِ اعتراض تھا کیونکہ اس کے نتائج خوشگوار نہیں ہو سکتے تھے۔ خدشہ تھا کہ کہیں ایسی قوم پیدا نہ ہو جس کا تعلق اپنے ماضی سے بھی اُستوار نہ ہو اور مستقبل کے متعلق بھی شکوک و شبہات کا شکار ہو ان کا مؤقف تھا کہ آباواجداد کے اعتقادات کو نظرانداز کرنا اچھا امر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اکبر کو مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ سے والہانہ لگاؤ ہے۔ وہ مسلمانوں کو جب مغربی تہذیب کی چمک دمک سے مرعوب ہو کر اپنی اقدار و روایات کو خیر باد کہتا دیکھتے ہیں تو انھیں مسلمانوں کی کج فہمی پر بہت دُکھ ہوتا ہے کبھی وہ نوحہ کناں ہو کر ان میں احساسِ زیاں بیدار کرتے ہیں کبھی وہ طنز کے نشتروں سے اصلاح کرتے ہیں تاکہ یہ قوم اپنے ماضی سے شناسا ہو کر اپنی کھوئی ہوئی منزل حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کرے۔ اکبر نے مذہب، سیاست، اخلاق اور معاشرت کی مغربی تہذیب کے زیرِ اثر بدلتی اقدار پر مزاحمت کرتے ہیں۔ بالخصوص خواتین کی بے مہار آزادی کو بے شمار بُرائیوں کی جڑ قرار دیتے ہوئے اسے اپنی تنقید کا ہدف بناتے ہیں کیونکہ اکبر اس حقیقت سے آشنا تھے کہ مغربی بود و باش کی رسیا خواتین اسلامی نظامِ معاشرت کا کار آمد حصہ نہیں بن سکیں۔

اکبر کو ان تہذیبی و اخلاقی قدار کا پاسدار خیال کیا جاتا ہے جن سے مشرقیت عبارت ہے۔ وہی مشرقیت جو ہندوستان کی متمدن زندگی کی اساس رہی تھی۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اکبر نے سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے ان امور کی بھرپور مخالفت کی جو انگریزوں کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئی تھی۔

اکبر زندگی کے تجربات سے گزر کر تفہیم حیات کے مرحلے تک پہنچتے ہیں اور اس کی تکمیل کے لیے قرآنِ پاک کی تعلیم کو ضروری سمجھتے ہیں۔ مذہب انسان کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذہب کے بغیر انسان ذہنی و روحانی طور پر بکھر جاتا ہے۔ اجتماعی مفاد کا احساس ختم ہو کر انفرادی نفع اندوزی کا جذبہ چھا جاتا ہے۔

اکبر کی شاعرانہ بصیرت کے سب معترف ہیں۔ان کی مغربی تعلیم کی مخالفت کی ایک وجہ اپنی تہذیب سے محبّت ہے۔ان کے دل میں اپنی قوم، اپنی تہذیب، اپنے لوگوں اور اپنی سماج سے بہت اُنس ہے۔انھیں اس ملک کی تہذیب و ثقافت سے جذباتی روحانی لگاؤ تھا۔وہ ان مشرقی تہذیب و ثقافت، اقدار کو محفوظ رکھنے کے قائل تھے۔ لیکن جب اکبر اپنی تہذیب کو جو ماضی کی روایات کے سانچے میں ڈھلی تھی بکھرتے ہوئے دیکھتے ہیں جب یہ قدیم تہذیب اچانک مغرب کی نئی قوم کے نظامِ تمدن سے ٹکرا کر بکھرتی ہے تو حسّاس فنکار کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔

اکبر کی سیاسی محاذ پر مقامی رہنماؤں کے خلاف بھی مزاحمت کی۔اکبر دور اندیش شخص تھے انھیں دُکھ تھا کہ کس طرح برِّصغیر کے مقامی باشندے اختلافات کا شکار ہو کر چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑتے جھگڑتے ہیں۔

اکبر کو ان لوگوں سے گلہ تھا جو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھے بغیر مغرب سے آنے والی ہر چیز کو قابلِ تحسین سمجھتے۔ سر سیّد کو چونکہ ان لوگوں کا سرخیل سمجھا جاتا تھا اس لیے سر سیّد تحریک کو بھی اکبر نے طنز و تمسخر کا ہدف بنایا۔ کیونکہ جدید تعلیمی نصاب آدمی کو ''صاحب'' یا ''بابو'' تو بنا دیتے ہیں ''آدمی'' نہیں بناتے۔ آدمی بنانے کے لیے روحانی اور ذہنی تصرف کے ساتھ انسان دوست تعلیم بھی درکار ہے۔اکبر اپنی بصارت سے متعلق حالات کا جائزہ لیتے۔اپنے دور کی ہر ہر آہٹ پر کان دھرتے ہوئے اس سے جذب و اثر قبول کرتے۔اکبر کے دل و دماغ میں مذہبی تعلیم کا راج تھا۔ دل اُسی کھوئی ہوئی عظمت کے لیے بے چین رہتا۔انگریزی حکومت و اقدار کے التہاب نے ہندوستانی ذہن و دِل کو اتنا کچلا کر دیا کہ وہ بے حس اور بد دل ہو گئے۔انگریزوں نے ہندوستانیوں سے حکومت چھینی تھی لہٰذا اکبر کو مسلمان ہونے کے ناتے اس کا بھی رنج تھا۔اکبر ایک طرف اپنی قوم کی سوئی ہوئی غیرت کو جگاتے۔ وہ اپنی تمام تر نکتہ آفرینی، بذلہ سنجی اور مزاحمتی شاعری کے ذریعے مغربی سیاست کے مکروہ چہرے سے پردہ ہٹاتے۔اکبر کو دُکھ تھا کہ انگریزی تعلیم کی روح کو پانے کے بجائے ہندوستانی محض ظاہری تعلیم حاصل کر رہے ہیں جس میں ہنر کی قلت ہے وہ یورپ اقوام کی محنت، مشقت، حکمت اور دور اندیشی سے سبق حاصل نہیں کرتے بس انگریزوں کی نقالی میں مگن ہو کر اپنی فطری طباعی کو کھو دیتے اور قومی حمیت کو مجروح کر دیتے ہیں۔

اکبر علم کا ایک اعلیٰ نصب العین رکھتے تھے وہ علم کی ذاتی رفعت کی جو نشانیاں دیکھ رہے تھے اُن سے انھیں بڑی مایوسی تھی وہ ایسے ذاتی علم سے نالاں تھے جس کا نتیجہ تنخواہ اور نوکری ہو۔ اگرچہ اکبر کے دور میں انگریزی حکومت میں نوکری کا حصول خاصا ذلت آمیز تھا۔اکبر کو ایسی تعلیم سے اُلجھن تھی جو تعلیم تو بہم پہنچا رہی تھی مگر علم کے دروازے نہیں کھولتی۔

انگریز حکومت کی چیرہ دستیوں، ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی، کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست کے اتار چڑھاؤ، گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون، کسان کا جھگڑا، جلیانوالہ باغ کا حادثہ اور تحریکِ خلافت، اکبر نے ان تمام امور پر حکومتِ وقت پر کھل کر تنقید کی اور مزاحمتی انداز اپنایا۔اکبر کے دور میں برِّصغیر کے افراد افراط و تفریط کا شکار تھے۔

اکبر نے اپنی مزاحمتی شاعری میں بہت سی علامتیں تراشی ہیں یہ علامتیں کبھی ایک لفظ کبھی ایک کردار پر مشتمل ہیں۔ تاہم اس کے پس منظر میں پوری معاشرت موجود ہے۔اکبر الٰہ آبادی نے ''شیخ'' کی علامت تراشی ہے جو مشرقی روایات کا دلدادہ ہے جو دین پر چلتا ہے لیکن با عمل نہیں اس کے کردار ور

قول و فعل میں منافقت بھی موجود ہے۔ اسی طرح ''جمن اور صلو'' غریب مسلمان کی علامت ہے جو مسلمانوں کی عمومی سیاسی صورتِ حال کے ترجمان ہیں۔

اکبر نے طنز و ظرافت پیدا کرنے کے لیے انگریزی الفاظ کا بھی بے تکلفی سے استعمال کیا ہے۔ یہ الفاظ اشعار کے سانچے میں ڈھل کر اپنی معنویت اور ترتیب کے لحاظ سے مؤثر ہو گئے ہیں۔ اور بعض اوقات انگریزی الفاظ کو بطور قافیہ بھی استعمال کر کے اپنی ہنر مندی کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً:

مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں ان کو
دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں (۱۰)

انگریزی الفاظ کو بطور قافیہ اس طرح استعمال کرتے ہیں:

زندگی اور قیامت میں ریلیشن سمجھو
اس کو کالج اور اسے کانووکیشن سمجھو (۱۱)

اکبر تلمیحات کا استعمال بھی تخلیقی سطح پر کرتے ہیں اور مروّجہ معنی سے ہٹ کر نئے معنی عطا کرتے ہیں۔ تلمیح کے اصل کردار ویسے ہی رہتے ہیں لیکن ان کے رویوں میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً حضرت یوسف اور زلیخا کے حوالے سے کہتے ہیں:

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہیں جواں بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی (۱۲)

اکبر نے پُرانی تراکیب، علامات اور اصطلاحات کو نئے مفاہیم عطا کیے ہیں۔ مثلاً: ترکِ عاشقِ اولی، بدھو میاں، جمن، پنڈت جی، گزٹ یا گزٹ۔

اکبر نے اشعار کے ذریعے مغلیہ زوال اور انگریزوں کے عروج کی داستان اشعار کی صورت میں قارئین کو سنائی۔ علاوہ ازیں حالات و واقعات کا جائزہ لے کر مزاحمتی انداز اپناتے ہوئے بد سلیقگی کو سامنے لے کر آئے۔ اکبر الفاظ کا بھرپور شعور رکھتے تھے۔ کیونکہ الفاظ کا شعور ایسی ذہنی حالت پیدا کرتا ہے کہ تخلیق کے سوتے پھُوٹنے لگتے ہیں۔ الفاظ کا شعور نئے معنی اور آواز کے ساتھ اُبھرتا ہے اکبر روایت کے خول میں مقید نہیں رہتے بلکہ ایک بسیط خلا میں پھیل کر مزاحمت کرتے ہیں۔ الفاظ انگریزی کے ہوں یا اردو کے مانوس ہوں یا غیر مانوس اس سلیقے سے ترتیب دیتے ہیں کہ الفاظ نئے معانی نئے ماحول سے آراستہ ہوتے ہیں۔ اکبر پوری ایمانداری اور انتہائی متانت کے ساتھ نامطاقبت کے تصور کو پورے تخلیقی جوش میں کام میں لاتے ہیں۔

اکبر کے کلام میں اخلاقی قدروں کی حدت بہت تیز ہے وہ اپنے اسلوب میں پُر خلوص انداز اپناتے ہوئے طنز و ظرافت اور مزاحمت کو بطورِ خاص اپنا کر حیات و کائنات کو جانچتے پرکھتے ہیں۔ اکبر نے مغرب کی اندھا دُھند تقلید کے خلاف مزاحمت کی۔ اکبر نے جب مغربی تہذیب کا جائزہ لیا تو ان کو مادہ پرستی دکھائی دی اس میں روحانیت کا فقدان نظر آیا۔ ان کی شاعری میں انجن، کلیسا، کونسل، کالج، موٹر، ریزولیشن جیسے الفاظ دراصل تہذیبِ نو کے استعارے ہیں۔ اکبر نے واشگاف الفاظ میں مغربی تہذیب و تعلیم کا مذاق اُڑایا اور مشرقی تہذیب سے محبّت کا اظہار کیا۔ اگرچہ سرکاری ملازم تھے۔ بعض اوقات وہ کھلم کھلا مزاحمتی رویہ اپنا کر انگریزوں کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں۔

یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام
مزیدار شاد ہوا توپ سے کیا پھیلا (۱۳)

کلام اکبر کے مطالعہ سے کچھ افراد نے اندازہ لگایا کہ اکبر رجعت پسند قدامت پرست ہیں خود بھی ماضی میں رہنا پسند کرتے ہیں اور قوم کو بھی ماضی کی جانب راغب کرتے ہوئے صرف مذہب پر تکیہ کر کے بیٹھنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ لیکن در حقیقت اکبر اس غلامانہ ذہنیت کے خلاف تھے۔ وہ مناجاتِ سحر سے بے گانگی پر معترض تھے۔ انھیں ڈبل روٹی کھانے، کلرکی کرنے، ملازمت کرنے پر اعتراض نہیں تھا ڈبل روٹی کھانا، مغربی تہذیب اپنانا، مہذب ہونے کی ایک نشانی تھی سکول میں نہ لٹریچر اپنا (مشرقی) پڑھایا جارہا ہے نہ اپنی تاریخ، ثقافت۔

ظاہر پرست کی مخالفت صوفیانہ شعری روایت کا بنیادی عنصر رہی ہے۔ اکبر نے ایسے عالم/صوفی کو بھی ہدفِ تنقید بنایا ہے، جن کا علم بغیر عمل کے ہے۔ ان کا یقین تھا کہ صداقت کی پاسداری نہ تو ظاہر پرستوں سے ممکن ہے اور نہ ہی اہلِ اقتدار سے۔ اسی لیے جب بھی اہلِ اقتدار کے غلط فیصلوں پر مہر توثیق ثبت کی گئی اکبر نے بھی غیر اخلاقی و غیر انسانی اقدار اور فرسودہ روایات کے خلاف مزاحمتی عنصر تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے بھی دیگر صوفی شعرا کے مانند زاہد و واعظ کے کردار کے تضاد اور مذہبی منافرت پھیلانے کی سیاست کو ہدفِ ملامت بنایا ہے۔

اکبر کا دور مسلمانوں کی تنزلی کا دور تھا مگر ان کا درد مند دل اس صورتِ حال کو قبول کرنے کے لیے تیّار نہ تھا جو اکبر اپنی قوم کی اصلاح کے خواہش مند تھے حالی نے قوم کی زبوں حالی پر نوحہ کناں رہے اکبر نے طنز و مزاح کے نشتروں سے اصلاح کا کام سر انجام دیا اور مغربی کا شکار اُمتِ مسلمہ میں خود شناسی و خود آگہی پیدا کرنے میں کامیاب رہے۔ اکبر مسلمانوں کے زوال کے اسباب، بے علمی، اپنی مشرقی قدروں سے دوری، اپنی روایات سے انحراف، انگریزوں سے خوشامدانہ اور غلامانہ طرزِ عمل کو قرار دیتے ہیں۔ اس پر طنز کرتے ہوئے مسلمانوں کو اصلاحِ احوال پر اکساتے ہیں۔

اگرچہ ہر شاعر کا کلام اپنے دور اور گرد و پیش کے حالات کا عکاس ہوتا ہے اکبر کا کلام اس دور کے انقلاب کی تصویر پیش کرتا ہے جو 1857ء کے بعد ہندوستان میں شروع ہوا اور انگریزی حکومت، جدید تعلیم اور انگریزی تہذیب و ثقافت کے اثرات برِّصغیر کے افراد پر پڑتے رہے اس میں نئے رجحانات نے جنم لیا۔ اکبر کے دور میں انگریز حکومت ہندوستان میں مستحکم ہو چکی تھی۔ انگریزی تعلیم، انگریزی علوم، انگریزی خیالات تیزی کے ساتھ پھیلنا شروع ہو گئے۔ اس دور میں ذہنی تصورات میں جو انقلاب ہوا اس پر اکبر نے اظہارِ خیال کیا۔ اکبر کا ذہن اس انقلابی تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے تیّار نہیں۔

اکبر کو مشرقی علوم کا بھی عرفان تھا اور مغربی علوم کو بھی قریب سے دیکھا۔ ان کے دل و دماغ میں مشرق کے زوال کے تمام اسباب محفوظ تھے۔ اکبر ایک بالغ نظر فنکار تھے۔ مزاحمت کے عناصر اکبر کے کلام کی تمام اصنافِ سخن میں موجود ہیں۔ انھوں نے مزاحمت کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا کہیں ان کا مقصد اصلاح ہے کہیں مزاح کے ذریعے، کہیں تعریفیں، کہیں طنز، کہیں تنقید۔ نور الرحمٰن لکھتے ہیں:

> ''اکبر کا مقصد کہیں اصلاح ہے تو کہیں مزاح، کہیں تعریفیں، کہیں تنقید، کبھی وہ چھپی ہوئی حقیقتوں کو آشکارا کرتا ہے اور کہیں کھلی باتوں پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔ وہ طنز کرتے ہیں مگر دُکھ نہیں دیتے۔ وہ مذاق اُڑاتے ہیں مگر تحقیر نہیں کرتے''۔ (۱۴)

اکبر کا کلام ایک مقصد کی جانب رہنمائی کرتا ہے لیکن ان کی شاعری کو مقصدی شاعری نہیں کہا جا سکتا۔ انھوں نے قوم و ملت کے حالات آشکار کیے۔ در حقیقت ان کا موضوعِ سخن انسان اور معاشرہ ہے وہ انسانی زندگی کے ہر پہلو تک رسائی چاہتے ہیں۔

اکبر نے معاشرت، مذہب، سیاست، قیادت، تعلیم، حکومت، تہذیب اور اخلاق سبھی کو طنز و ظرافت کا نشانہ بنایا۔ ڈاکٹر طارق کلیم لکھتے ہیں:

''اپنی شاعری میں اکبر باقاعدہ مزاحمتی شاعر نظر آتے ہیں۔ ایسے مزاحمتی شاعر جس نے مزاحمت کے لیے مزاح اور ظرافت کا پیرایہ اختیار کیا وہ اپنے دور کی مثبت مشرقی اقدار کو انگریز کی دست برد سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے''۔(۱۵)

معاشرے سے اخلاص، وضع داری، رواداری، برداشت، تحمل، ایثار، قربانی، بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، شرم و حیا اور بہت سی مثبت روایات اور قدریں ختم ہو رہی تھیں جو کہ معاشرے کے لیے نقصان دہ تھیں۔ اکبر ان روایات کو بچانے کے لیے میدان میں آئے وہ مغربی معاشرے کے نقاد بھی تھے اور انھوں نے منفی روایات کو اپنی تنقید کا نشانہ بنا کر مزاحمت کا اظہار کیا۔ اکبر کی ایک مشکل یہ تھی کہ وہ اپنی تہذیب کو جو ماضی کی عظیم روایتوں کے سانچے میں ڈھلی تھی منتشر ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے جب یہ مشرقی تہذیب و تمدن اچانک مغرب کی نئی قوم کے نظامِ تمدن سے ٹکرا کر منتشر ہونے لگی تو اکبر کے ذہن کو جھٹکا لگا۔

اکبر نئی تعلیم کے تمام نقائص پر نگاہ رکھنے کے باوجود جدید تعلیم کی افادیت سے منکر نہیں۔ عزیز لکھنوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''پُرانی روشنی اپنی مجموعی خیالی حالت کا شیفتہ ہے۔ نئی روشنی اپنی منفرد یعنی واقعی حالت کا شائق ہے۔ نیچر نئی روشنی کے ساتھ ہے۔ کوئی زبردست طاقت نہیں ہے کہ نیچر کو پُرانی روش کے مقاصد کے تابع کر کے مجموعی حالت میں لائے۔ آپ (عزیز لکھنوی) کا خیال صحیح ہے کہ پرانے بزرگ لکیر کے فقیر اور ضرورتِ زمانہ سے بے خبر ہیں''۔(۱۶)

اکبر روشن خیال تھے وہ مغربی تعلیم کے مخالف نہ تھے اگر وہ مغربی جدید تعلیم کے مخالف ہوتے تو اپنے بیٹے عشرت کو حصولِ تعلیم کے لیے یورپ نہ بھجواتے نہ ہی اکبر تنگ نظر تھے اگر تنگ نظر ہوتے تو جوانی میں ستار نہ بجاتے بلکہ کسی مسجد کے پیشوا یا مکتب کے معلم ہوتے۔ اکبر نے اپنے دور کے حالات کو دیکھتے ہوئے مزاحمت کا اظہار کیا۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''ہندوستانی لوگ مغربیت کے اتنے دلدادہ ہو گئے تھے کہ انگریز بننا اپنا فخر سمجھتے تھے، ہر ہندوستانی چیز کو حقارت سے دیکھتے تھے۔ یورپی نام و یورپی لباس، یورپی بعام، یورپی وضع قطع مرغوبِ خاطر تھی۔ انگریزی گفتگو ایک خاص طغرائے امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ ہر انگریزی چیز خواہ کیسی ہی ہو ہندوستانی چیز سے بہتر خیال کی جاتی''۔(۱۷)

اکبر الٰہ آبادی علم و ہنر کے حصول کے قائل تھے وہ نئی تعلیم جدید تعلیم کے حامی تھے۔ اکبر اپنی ذہانت اور قابلیت کی بدولت منشی کے عہدے سے جج کے عہدے تک پہنچے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو بھی انگریزی تعلیم حاصل کروائی۔ وہ اپنے اہلِ وطن کو اس جدید روشنی سے محروم نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ علم و ہنر سے استفادہ کر کے ترقّی کی منازل عبور کرنے کے قائل ہیں بلکہ وہ تو خود کہتے ہیں۔

اکبر ہندوستان کے نوجوانوں کا روشن مستقبل دیکھنے کے خواہاں تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ تعلیم اور ترقی حاصل کرنے کے بعد جو قوم بنے وہ مشرقی ہو مسلمان ہو۔

اکبر الٰہ آبادی امن پسند شاعر تھے لیکن جارح کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بجائے وہ اپنے دفاع کی خاطر ڈٹ جانے کو زیادہ اہم خیال کرتے ہیں۔ انھیں مغرب کے اس جانب دارانہ طرزِ عمل سے شدید نفرت تھی جو جبر واستبداد پر ردِّ عمل کے بجائے ظلم سہنے کی ترغیب دیتا ہے کیونکہ اس طرزِ عمل کے مطابق جبر کا مقابلہ بجائے خود ایک منفی عمل ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے مظلوم طبقے کا ساتھ دیا۔ وہ ظالم، جابر اور آمر کے ساتھ وابستگی نہیں رکھتے بلکہ اپنے علم و ہنر اور فن سے عوام الناس اور مجبور آدمی کی محرومیوں اور پریشانیوں کو موضوعِ سخن بناتے ہیں۔ دراصل اکبر اپنے ہم وطنوں کے حقوق کی پامالی، بدحالی اور نام نہاد آزادی کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں انھیں جب بھی اپنے ہم وطن اپنے ہی وطن میں بے یار و مددگار، ظلم کا شکار دکھائی دیتے ہیں وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر اشعار کی صورت میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

برِّصغیر میں انگریزوں کے غلبے کے بعد اکبر نے محسوس کیا کہ وہ تہذیب جس نے ایک ہزار برس کے سفرِ حیات میں جو صورت بنائی وہ بکھر رہی ہے۔ امکان ہے کہ عنقریب یہ تہذیب نئی مغربی تہذیب کے سامنے شکست کھالے گی اور اس شکست کے نتیجے میں وہ اپنی تخلیقی قوتیں گنوا بیٹھیں گے مسلمان فطری سطح پر مقلد، پیروکار تو ہوں گے لیکن راہبر نہیں بن سکیں گے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''اکبر نے اپنے دور میں جو کچھ کہا تھا آج وہ حقیقت بن کر ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہم تہذیبِ مغرب کے پرستار بن کر اب صرف اسی راستے پر چل رہے ہیں جس راستے پر مغرب ہم کو چلا رہا ہے''۔(۱۸)

اکبر کی شاعری کا خاص رنگ طنز و ظرافت بھی ہے انھوں نے حیاتِ انسانی کے تلخ حقائق کو نہ صرف دیکھا بلکہ محسوس بھی کیا ان کے طنز کا مقصد زندگی کے ٹھوس حقائق اور سنجیدہ مسائل کی طرف سائلین کی توجہ مبذول کروانا تھا اکبر انجام سے بے نیاز اثرات سے بے خبر اور نتیجے سے بے پرواہو کر ہنسی ہنسی میں وہ سب کچھ کہہ دیتے ہیں جسے وہ مناسب سمجھتے تھے۔

اکبر کی شاعری برِّصغیر پاک و ہند کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کے کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے۔ انھوں نے اپنے دور کے سیاسی، سماجی، معاشی، ذہنی معاملات و واقعات کو کہیں تند و تلخ انداز میں بیان کیا اور کہیں دھیمے لہجے میں حق بات کہہ دی جسے وہ کہنا مناسب سمجھتے تھے۔ اکبر اولین شاعر ہیں جنھوں نے سب سے پہلے انگریز سامراج کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''انگریزی اور انگریزیت کے طلسم پر پہلی ضرب اس زمانے میں لگائی جب انگریزوں کا سطوت و جبروت کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان کا کیا ذکر ساری دنیا میں ان سے آنکھ ملانے کی کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی اور اس طرح لگائی کہ پھر اسے پنپنا نصیب نہ ہوا''۔(۱۹)

اکبر الٰہ آبادی قوم کے متعلق نئے انداز سے اظہارِ خیال کرتے ہیں وہ نہ تو آنسو بہاتے ہیں نہ ہی صبحِ نو کے ترانے گنگناتے ہیں بلکہ ان کا انداز منفرد ہے اکبر کے دور میں قدیم تہذیب دم توڑ رہی تھی اور جدید تہذیب کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے بخوشی اپنایا جا رہا تھا۔ اکبر قدیم اقدار سے محبّت کرتے ہیں لیکن اکبر مثبت تبدیلی کے خواہاں تھے۔ اکبر کی شاعری کا نصب العین ہندوستان میں ایک پُرامن مذہبی جدید مشرقی معاشرے کی ترویج تھی مگر انھیں اپنے مذہب اور روایات کے تحفظ کا خاص طور پر احساس تھا۔ اکبر نے اپنی شاعری کی اساس تحلیل و تجزیہ اور قومی احساس کو بنایا۔ اکبر کی

شاعری کا اہم موضوع تہذیب، معاشرت، مذہب، روحانیت، اخلاقیات اور مشرقی اقدار تھا۔ انھوں نے مشرق و مغرب، قدیم و جدید، مذہب اور سائنس کے تمام پہلوؤں کو موضوع بنایا۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''انھوں نے جو موضوع چاہا اختیار کیا جو زبان چاہی استعمال کر ڈالی جو لہجہ جی میں آیا اختیار کر لیا۔ انھوں نے ہر بات ہر طریقہ سے کہی ہے۔ ثقافت کی زبان میں، عوام کی زبان میں، مولویوں کی زبان میں، شاعروں کی زبان میں''۔**(۲۰)**

اکبر ان حالات میں بھی مایوس نہیں ہوتے وہ تمام تدابیر کے ناکام ہونے کے بعد بھی زندگی کے اس امتحان میں روحانیت کا سہارا لے کر امید، دعا اور صبر سے کام لینے کی تلقین کرتے ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی کا دور ایک اہم دور تھا جب برِّصغیر پاک و ہند میں سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی اور ذہنی سطح پر تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ یہ تبدیلیاں ظاہری طور پر خوشگوار بھی تھیں اور ناگوار بھی۔ اکبر ایک حساس فنکار تھے انھوں نے ان تبدیلیوں کو دیکھا اور ناپسندیدہ عناصر کے خلاف اپنی شاعری کے ذریعے مزاحمت کی۔

اکبر الٰہ آبادی کی شاعری سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اگرچہ مزاحمت کا جذبہ ظریف شعرا کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہوتا ہے۔ اکبر نے اپنی معاشرت، سیاست، تہذیبی و مذہبی قدروں کی کج روی، کج مروّتی اور کج اخلاقی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے مزاحمتی انداز اپنایا اور ایسی زبان استعمال کی جو قابلِ گرفت بھی نہ ہو۔ اکبر کو مغربی تعلیم کی عصبیت پسند نہ تھی اس نظامِ حیات کی جھوٹی نمود و نمائش سے نفرت تھی۔ انھیں یہ گوارہ نہ تھا کہ ان کے مشرقی نظامِ حیات و تہذیب کی معصومانہ روش سے انگریزی تہذیب کا ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ انھیں انگریزی سے نہیں انگریزی قدروں کی ملمع سازی سے نفرت تھی۔ لہٰذا وہ پوری ایمانداری اور سلیقے سے مزاحمت کے تیر چلاتے ہیں۔ استعماریت، جارحیت اور ظلم کے خلاف مؤثر مزاحمت اور احتجاجی رویے نے اکبر الٰہ آبادی کو منصور بن حُلاج کا ہمراہی بنا دیا۔ انھوں نے انقلابی افکار و نظریات کو تخلیقات میں بیان کیا۔ ان کی شاعری میں پائے جانے والے احتجاجی، انقلابی اور مزاحمتی عناصر پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اکبر چونکہ معاشرے کے حسّاس فرد تھے وہ مسلمانوں کو مزید شکست و ریخت کے گڑھوں میں گرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے وہ قومی وجود کو مغربی تہذیب کے سمندر میں ضم کرنے کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے سیاسی اور معاشرتی رویوں، سطحوں پر مزاحمتی رویہ اپنایا مگر زیادہ تر اس کا نشانہ سیاسی اور مقتدر شخصیات بنیں۔ ایک ایسے دور میں جہاں انسانی جذبات کی تطہیر ہو سکے ایسے ماحول میں عموماً وہی لکھا جا سکتا ہے جو بادشاہِ وقت کو پسند ہو اس تناظر میں اکبر الٰہ آبادی نے جرأت کے ساتھ جو لکھا وہ قابلِ تحسین ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد اقبال، ڈاکٹر۔ حیاتِ اکبر۔ مطبوعہ، بزمِ اکبر۔ کراچی۔ ص۱۲۹

۲۔ اکبر الٰہ آبادی: کلیاتِ اکبر، کراچی: العلم پبلشرز، س ن۔ ص۹۹

۳۔ ایضاً۔ ص۱۰

۴۔ ایضاً۔ ص۱۳۱

۵۔ ایضاً۔ ص۳۹۴

٦۔ ایضاً۔ ص۵۰۹

۷۔ ایضاً۔ ص۵۷

۸۔ ایضاً۔ ص۳۰۸

۹۔ ایضاً۔ ص۲۲۳

۱۰۔ ایضاً۔ ص۴۱۷

۱۱۔ ایضاً۔ ص۲۱٦

۱۲۔ ایضاً۔ ص۱۵۳

۱۳۔ ایضاً۔ ص۴۲۰

۱۴۔ نورالرحمن۔ اکبرالٰہ آبادی اور ان کا کلام۔ دہلی: مکتبہ شاہراہ، ۱۹۹۴۔ ص۱۰

۱۵۔ کلیم طارق، ڈاکٹر۔ اردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمتی عناصر۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۱۔ ص۲۲۰

۱٦۔ مہیش پرساد رائے صاحب راجہ دیال گروال۔ مشاہیر اردو کے خطوط۔ الٰہ آباد: ۱۹۳۳۔ ص۳۰

۱۷۔ جمیل جالبی۔ ڈاکٹر، تاریخ ادبِ اردو (جلد سوم)، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۷۔ ص۳۲٦

۱۸۔ ایضاً۔ ص۳۸۱

۱۹۔ رشید احمد صدیقی۔ اکبرالٰہ آبادی کی شاعری۔ علی گڑھ میگزین (اکبر نمبر)، ۱۹۵۱۔ ص۱۲

۲۰۔ ایضاً